JOURNAL'S PROFILE

Journal of Research (Urdu) is a bi-annual "Y" category journal approved by Higher Education Commission of Pakistan.
It started in 2001 from Bahauddin Zakariya University, Multan (Pakistan). At that time, it was owned by the Faculty of Languages & Islamic Studies. Later in 2008, Higher Education Commission of Pakistan recognized it as a research journal of Urdu in Category "Z". Since then, it is owned by the Department of Urdu, BZU, Multan. In 2014, it was upgraded and accepted for Category "Y".

CONTACT

Dr. Muhammad Khawar Nawazish
Editor, Journal of Research
Department of Urdu, BZU Multan-60800

MOBILE:
+92 300 9561745

WEBSITE:
https://jorurdu.bzu.edu.pk/website/

EMAIL:
jorurdu@bzu.edu.pk
khawarnawazish@bzu.edu.pk

ADDRESS

Office of the Journal of Research (Urdu), Department of Urdu, Bahauddin Zakariya University, Multan

JOURNAL OF RESEARCH (URDU)

ISSN (Print): 1726-9067, ISSN (Online):1816-3424
Volume No. 40, Issue No.01

TITLE OF THE PAPER

معاصر اُردو نظم: ماحولیاتی تنقید کے تناظر میں

AUTHOR(S)

* Dr. Ahtisham Ali
Associate Professor, Department of Urdu
Govt. College University, Lahore

CONTACT
dr.ahtisham@gcu.edu.pk

HISTORY OF THE PAPER

Received on: April 02, 2024
Accepted on: June 25, 2024
Published on: June 30, 2024

DETAIL(S)

Volume No. 40, Issue No. 01, Page No: 32-41
Publisher:
Department of Urdu, Bahauddin Zakariya University
Multan (Pakistan)-60800

LICENSE

This work is licensed under a Creative Commons Attribution 4.0 International License

COPYRIGHT

©The author(s) 2024. ©Journal of Research (Urdu) 2024.
This publication is an open access article.

Journal of Research (Urdu)
ISSN (P): 1726-9067, ISSN (E):1816-3424
Volume No. 40, Issue No. 1, June 2024

* ڈاکٹر احتشام علی

معاصر اردو نظم: ماحولیاتی تنقید کے تناظر میں

Contemporary Urdu Poem: In the perspective of Eco-Criticism

ABSTRACT

For the last few years, the discussion of Ecocriticism has been greatly promoted in Urdu language and literature, but most of the critics have limited the scope of environmental studies by considering it as similar to naturalism. In this article, an attempt has been made to look at contemporary Urdu poetry in the context of environmental criticism and without getting involved in theoretical debates, the trends emerging in contemporary Urdu poetry have been marked which are based on environmental resistance and eco feminism.

KEYWORDS

Ecocriticism,Urdu Poetry, Environmental Resistance, Ecofeminism

جدید اردو نظم جس کا آغاز 1874ء میں ایک نوآبادیاتی ادارے انجمنِ پنجاب کی چھتر چھایا میں ہوا اپنی ابتدا ہی سے فطری مظاہر سے منسلک رہی۔ نیچرل شاعری کا ڈول ڈالنے والوں نے جب نظمیہ مشاعروں کے عنوانات کا انتخاب کیا تو ابتدائی دونوں مشاعروں میں پڑھی جانے والی نظموں کے عنوانات "برسات" اور "زمستاں" تھے۔ گو تیسرے مشاعرے سے آخری مشاعرے تک کے موضوعات ایک مخصوص تہذیبی اور قومی سیاق میں سامنے آئے، لیکن انجمن کے مشاعروں کے ذریعے نیچرل شاعری کے جس تصور کو پروان چڑھانا مقصود تھا اُس پر درج بالا دونوں مشاعروں کے عنوانات ہی پورے اترتے تھے۔ انیسویں صدی کے اختتام تک مغربی نظم کے اردو تراجم اور بعد ازاں رومانویت کے تحریک کے زیرِ اثر جس نظمیہ شاعری کو مقبولیت ملی اُس میں فطرت نگاری ایک بنیادی جوہر کے طور پر سامنے آئی۔ اسماعیل میرٹھی، نظم طباطبائی، محسن کاکوری، حامد اللہ افسر اور تاجور نجیب آبادی نے نہ صرف رومانوی انگریزی نظم کو تراجم کے ذریعے اردو قالب میں ڈھالا بل کہ اپنی شاعری میں بھی فطرت نگاری کو اولیت دی۔

Published by:
Department of Urdu
Bahauddin Zakariya University, Multan (Pakistan)-60800
Website: https://jorurdu.bzu.edu.pk/website/

بیسویں صدی کے نصفِ اول میں جہاں احسان دانش، اختر شیرانی، جوش ملیح آبادی، حفیظ جالندھری اور عظمت اللہ خان کی شاعری ہمارے سامنے رومانویت اور فطرت پسندی کی عمدہ مثال بن کر سامنے آتی ہے، وہیں بیسویں صدی میں اردو نظم کی سب سے توانا آواز علامہ محمد اقبال کی ابتدائی شاعری، مغربی رومانویت کے زیرِ اثر فطرت نگاری کے نئے منظر نامے سے روشناس کرواتی ہے۔ بانگِ درا کی ابتدائی ماخوذ نظمیں جیسے 'مکڑا اور مکھی'، 'پہاڑ اور گلہری'، 'ایک گائے اور بکری'، 'ہمدردی'، 'پرندے کی فریاد' کے علاوہ 'اک آرزو'، 'رخصت اے بزم جہاں'، 'آفتابِ صبح'، 'گلِ پژمردہ' اور 'ماہِ نو' کا منظر نامہ مغربی فطرت نگاری کے بہت سے نقوش اپنے دامن میں صورت پذیر کیے ہوئے، اِس ضمن میں اقبال خود اپنی شاعری اور شخصیت پر ورڈز ورتھ کے گہرے اثرات کا ذکر کرتے ہوئے ایک خط میں لکھتے ہیں کہ "زمانۂ طالب علمی میں مجھے ورڈز ورتھ کی شاعری نے دہریت سے بچا لیا تھا۔"(1) اقبال کے بعد میراجی کے ہاں قدیم ہندوستانی تہذیب کا لینڈ سکیپ اُبھر کر سامنے آتا ہے اور وہ اپنے آشوبِ ذات سے فرار اختیار کر کے جنگل کے سکوت، تاریکی اور تنہائیوں میں پناہ ڈھونڈتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

اوپر درج معروضات کا مقصد محض یہ باور کروانا ہے کہ جدید اردو شاعری کے آغاز سے لے کر بیسویں صدی کے نصف تک ہمیں لگ بھگ تمام شاعروں کے ہاں ہی فطری مظاہر سے انسلاک کا عمل نظر آتا ہے، لیکن یہ سب کسی ماحول پسند فکر سے اکتساب کا نتیجہ نہیں تھا بل کہ اِس کی جڑیں اردو شاعری کی اُس کلاسیکی روایت میں پیوست تھیں، جہاں مثنوی اور مرثیے جیسی بیانیہ اصناف میں ارد گرد بکھرے مظاہر اور مناظر کو جزئیات نگاری کے ساتھ بیان کیا جاتا تھا۔ بیسویں صدی کے وسط میں جب مغربی مفکرین نے فلسفۂ ماحولیات کی بنیادیں استوار کیں تو اس زمانے میں بھی اردو شاعری میں مجید امجد جیسا نابغہ محض ایک دلِ درد مند کے طور پر اپنی دھرتی کے انسانوں ہی سے نہیں بل کہ پرندوں، جانوروں اور درختوں سے بھی موانست کا رشتہ استوار کیے ہوئے تھا۔ 'توسیعِ شہر'، 'ہڑپے کا ایک کتبہ'، 'ایک کوہستانی سفر کے دوران میں'، 'افریشیا'، 'اے ری چڑیا' اور 'پکار' جیسی نظمیں کسی نظریے یا آدرش کے تحت نہیں لکھی گئی تھیں بل کہ اِن نظموں میں مجید امجد کا آفاقی شعور اُنھیں، اِس سرزمین پہ سانس لیتی تمام مخلوقات اور مظاہر کے ساتھ ہمدردی اور ہم دِلی کے رشتے سے منسلک کر رہا تھا۔ یاد رہے ولیم روئیکرٹ (William Rueckert) کی ماحولیاتی تنقید یعنی ایکو کرٹسزم (Ecocriticism) کی اصطلاح جس نے ادب اور ماحول کی ہم رشتگی کے سوال

پر ایک نئے طرزِ مطالعہ کی بنیاد رکھی جب 1976ء میں منظرِ عام پر آئی (2)تب مجید امجد کے انتقال کو دو برس کا عرصہ بیت چکا تھا۔ خاطر نشان رہے کہ پچھلے چند برسوں سے اردو تنقید میں ماحولیاتی تنقید سے متعلق جن مباحث کا آغاز ہوا ہے ان میں بیشتر ناقدین فطرت نگاری اور ماحولیاتی تنقید میں خطِ فاصل کھینچے بغیر مضامینِ نو کے انبار لگا رہے ہیں۔ ماحولیاتی تنقید جس کی اساس انسان کے اپنے ارد گرد بکھرے فطری مظاہر، پرندوں، جانوروں اور دیگر غیر انسانی موجودات کے ساتھ ایک انصاف اور احترام کا تعلق استوار کرنے پر رکھی گئی تھی، چند ایک استثنائی آوازوں کے علاوہ بہت سوں نے اُس طرف توجہ نہیں کی۔ یہی وجہ ہے کہ جدید اردو نظم کے بیش تر ماحولیاتی مطالعات میں جن جدید نظم نگاروں کا ذکر ملتا ہے اُن میں سے زیادہ تر کی نظموں کو محض فطرت نگاری ہی کی بنیاد پر مضامین کا حصہ بنایا جاتا ہے۔ راقم کی عاجزانہ رائے میں مجید امجد کے بعد جس دوسرے اہم نظم نگار کے ہاں غیر انسانی موجودات کے دُکھوں اور کرب کو اپنی نظموں میں سمو کر ایک موانست کا رشتہ استوار کیا گیا ہے وہ ساقی فاروقی ہیں، جن کی شعریات پر اِس ضمن میں بہت کم توجہ کی گئی ہے۔ ساقی کی نظموں میں ہمیں اُس "بشر مرکز" یا ہیومن سینٹرک اپروچ(Human Centric Approach) کے خلاف مزاحمت ملتی ہے جس کے تحت انسان خود کو اِس ساری کائنات کا مرکز و محور اور تمام وسائل کا بلا شرکتِ غیر حاکم سمجھتا ہے اور پھر باقی مخلوقات کو اپنی آزِ خونخوار کا نشانہ بنانے میں ایک لمحہ بھی پس و پیش سے کام نہیں لیتا۔ ساقی کی نظموں کے مرکوز مطالعے سے یہ بات واضح ہو کر سامنے آتی ہے کہ وہ اِس کا کرۂ ارض کو محض انسان کی جاگیر نہیں سمجھتے بل کہ سؤر، کتوں، خرگوش اور مینڈک جیسے حیوانات کی حاشیائی حیثیت کو بھی معرضِ سوال میں لاتے ہیں۔ ساقی کے نظریہ شعر پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالیں تو وہ کائنات کے مختلف مظاہر پر دیگر مخلوقات کو بھی انسانوں جتنا ہی استحقاق دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی نظموں میں انسان اور کائنات کے باہمی رشتوں کو غیر انسانی موجودات یعنی حیوانات، حشرات الارض اور نباتات کی مدد سے سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ شیر امداد علی خان کے لیبارٹری میں چھیر پھاڑ اور تجربات کے لیے استعمال ہونے والے مینڈک ہوں یا جان محمد خان کے بورے میں بند زخمی بلا؛ اپنے ہی خون میں لت پت خرگوش ہوں یا وہ سؤر جن کی کھال سے ہش پپیز(Hush Puppies) جوتے بنائے جاتے ہیں، ساقی کی نظموں میں ہمیں ان سبھی کی بے بسی اور لاچارگی کا بیانیہ ملتا ہے۔ یہ نظمیں بشر مرکز کائنات میں اُن بے زبانوں کی بے پناہ اذیتوں کا بیانیہ ہیں جن کی زندگی اور موت کا اختیار پہلے ہی دن سے اشرف المخلوقات کے ہاتھ

میں ہے۔اِس ضمن میں نظم 'امانت'،'شیر امداد علی کا میڈک'،'ایک سور سے'،'پام کے پیڑ سے مکالمہ'،'خرگوش کی سرگزشت'،'خالی بورے میں زخمی بلا'اور 'مکڑا'استحصال اور جبر کے وہ تمام نقوش اپنے ساختیے میں صورت پذیر کیے ہوئے ہیں، جن سے ماحولیاتی مزاحمت کی اُن تحریکوں کو جِلا ملتی ہے، جو کائنات میں بسنے والی تمام مخلوقات کی تکریم کا مطالبہ کرتی ہیں۔اِس ضمن میں ساقی کی دو نظمیں ملاحظہ فرمایئے:

اِک قصبے کے/اِک سکول میں/اِک لڑکے نے
تھکی ہوئی اِک تتلی پکڑی تھی/اور رہائی کی کوشش میں
اُس تتلی کے پروں کا نیلا اودا رنگ/فضا میں بکھر گیا تھا
اُس لڑکے نے میز کے اوپر/پیپر ویٹ کے نیچے رکھ کر
اُس کے پر ماچس سے جلائے/اور اُس کا دھڑ/پنسل کاٹنے والے چاقو سے
دو حصوں میں بانٹ دیا تھا/وہ لڑکا تو چلا گیا/پر تیس برس سے
اُس کا گندہ چاقو میرے پاس ہے/اور چاقو پر
اُس مٹیالے پیلے خون کے دھبے سے اُلجھن ہے
اور زباں پر ایک کسیلا پن ہے/اتنی تھکن ہے/نیند سے پاگل ہوں
امانت،(3)

جان محمد خان/سفر آسان نہیں/دھان کے اس خالی بورے میں/جان الجھتی ہے
پٹ سن کی مضبوط سلاخیں دل میں گڑی ہیں/اور آنکھوں کے زرد کٹوروں میں/چاند کے سکے چھن چھن گرتے
اور بدن میں رات پھیلتی جاتی ہے/آج تمہاری ننگی پیٹھ پر/آگ جلائے کون/انگارے دہکائے کون

Journal of Research (Urdu)
ISSN (P): 1726-9067, ISSN (E):1816-3424
Volume No. 40, Issue No. 1, June 2024

جد وجہد کے /خونیں پھول کھلائے کون/میرے شعلہ گر پنجوں میں جان نہیں/آج سفر آسان نہیں

تھوڑی دیر میں یہ پگڈنڈی/ٹوٹ کے اِک گندے تالاب میں گر جائے گی

میں اپنے تابوت کی تنہائی میں لپٹ کر سو جاؤں گا/پانی پانی ہو جاؤں گا/اور تمھیں آگے جانا

اِک گہری نیند میں چلتے جانا ہے/اور تمھیں اس نظر نہ آنے والے بورے/اپنے خالی بورے کی پہچان نہیں

جان محمد خان/سفر آسان نہیں

خالی بورے میں زخمی بلا (4)

اوپر درج پہلی نظم کا متکلم تیس برس سے ایک ایسے احساسِ گناہ میں مبتلا ہے، جس نے اُس کی زبان کو ذائقوں سے محروم کر دیا ہے۔ مردہ تتلی کے مٹیالے خون کے دھبے اُس کے لیے اسی طرح کی الجھن کا باعث ہیں جس کا سامنا لیڈی میکبتھ (Lady Macbeth) کو کرنا پڑا تھا۔ تتلی کرہ ارض پر سانس لیتی اُن تمام مخلوقات کی علامت ہے جنھیں انسان محض اپنی وحشت کی تسکین کے لیے ظلم و بربریت کا نشانہ بنا دیتا ہے۔ گو اِس نظم کے متکلم کے ضمیر پر لگنے والے کچوکے اُس کی زندگی کی تھکن کو بڑھا کے بے خوابیوں میں تبدیل کر رہے ہیں لیکن ہمارے ارد گرد موجود کروڑوں انسان، غیر انسانی موجودات پر بہیمانہ ظلم کر کبھی کسی ندامت یا شرمندگی سے دوچار نہیں ہوتے۔ ساقی کی دوسری نظم جدید اردو نظم کی روایت میں اِس اعتبار سے بھی اہم ہے کہ اِس کا متکلم انسان نہ ہو کر بھی سب آلٹرن (Subaltern) کی طرح بول پڑا ہے۔ دِل میں گڑی پٹ سن کی سلاخیں، دھان کے بورے میں الجھتی جان اور گندے تالاب کی گہرائیوں کی جانب بڑھتا ہوا زخمی وجود اُس تمام مخلوق کی بے بسی اور لاچارگی کا نوحہ ہے، جسے اس کائنات ہی کے ایک حیاتیاتی فرد نے موت اور اذیت کی گھاٹی میں اتار دیا ہے۔ نظم کی آخری سطروں میں خود انسان کے فنا کی پگڈنڈی کی جانب اٹھتے قدم اُن نادیدہ آفات اور قدرت کے انتقام کی طرف کنایہ کرتے ہیں، جس کی ایک جھلک ہمیں چند برس قبل کووڈ19 (Covid-19) کی صورت میں دکھائی دی تھی۔

معاصر اردو نظم کے بہت سے اہم نظم نگاروں کی نظموں میں صنعتی اور مشینی تہذیب کی اجارہ داری کے خلاف ماحولیاتی مزاحمت کا بیانیہ ملتا ہے۔ بیسویں اور اکیسویں صدی میں ماحولیاتی جبر کی شدت کو معاشرے کے حساس اذہان نے اپنی روح کی گہرائیوں میں محسوس کیا اور جدید فرد کے فطرت سے منقطع ہونے والے رابطوں کے اسباب کو علامتی رنگ میں نشان زد کیا۔اِس ضمن میں ذیشان ساحل کی یہ نظم دیکھیے جس میں "انجن" جیسی غیر شاعرانہ علامت اسی مشینی تہذیب کی نشان کنندہ ہے جس نے انسان کو اُس کی فطری دنیا اور اُس کے مظاہر سے محروم کر دیا ہے:

اِک دوپہر بہار تھی پٹڑی پہ ریل کی/ انجن نے آ کے پھول ہمارے کچل دیے
سوئے ہوئے تھے گھاس میں تارے کچل دیے/ تتلی کے پر، دلوں کے کنارے کچل دیے
ایسا لگا کہ گیت بھی سارے کچل دیے/ لیکن کسی کو چیخ سنائی نہ دے سکی/ تصویر زندگی کی
دکھائی نہ دے سکی
سبزے سے پھول خاک کی آغوش میں گیا/ پانی کا شور وادیِ خاموش میں گیا
ٹکڑوں میں خواب ہم سے بچایا نہ جا سکا/ گلدستۂ بہار بچایا نہ جا سکا (5)

پھولوں، ستاروں، تتلی کے پروں اور دلوں کے کناروں کے ساتھ ساتھ نغموں کا کچلا جانا اور کسی کو چیخ تک کا سنائی نہ دینا، مظاہرِ فطرت سے محرومی کا وہ سانحہ ہے جس کا احساس ہمیں شاید بہت دیر سے ہوا ہے۔ مسموم فضاؤں میں سانس لینے والے آج جب سموگ (Smog) کا رونا روتے ہیں تو اِس حادثے کی پرورش کرنے والے اُن محرکات کا سدِ باب کرنے کی کوشش نہیں کرتے جس نے پھولوں اور سبزے کو مٹی میں اور پانی کو گدلی زمین میں دفن کر دیا ہے۔ ایک شاعر فکری مزاحمت کے ذریعے ہمارے سوئے ہوئے ضمیر کو تو جھنجھوڑ سکتا ہے لیکن گلدستۂ بہار کو پھر سے حاصل کرنے کے لیے کوشش کرنا اُس کے اختیار سے باہر ہے۔اِسی طرح زمین جس تیزی سے آبی ذخائر سے محروم ہو رہی ہے معاصر اردو نظم ہماری توجہ اُس جانب بھی مبذول کرواتی ہے۔ مرتے ہوئے پانی کو معرضِ سوال میں لا کر زمیں زادوں سے پوچھے گئے کئی سوال ہمیں نصیر احمد ناصر کی 'بصارت کا قحط'، 'بارش کیسے لائیں' اور 'ویپ ہولز' جیسی نظموں میں سنائی دیتے ہیں۔ چند مصرعے دیکھیے:

زمیں زادے/ تجھے تو کچھ دکھائی بھی نہیں دیتا/ سقاوہ کب سے خالی ہے

Journal of Research (Urdu)
ISSN (P): 1726-9067, ISSN (E):1816-3424
Volume No. 40, Issue No. 1, June 2024

نہ اوپر ابرِ باراں ہے/نہ اب زیرِ زمیں/آبِ بقا ہے/عالمِ فُطرات غائب ہے
نباتاتی تبسم کھو گیا ہے/تابکاری خواہشوں کا بول بالا ہے/
رگوں میں ریگ ماہی، سانپ، بچھو رینگتے ہیں/نظر کے آئنے بے آب ہیں
اندر زبوں حالی ہے/باہر خشک سالی ہے/یبوست ہی یبوست ہے
خجالت ہی خجالت ہے/زمیں سے کیا یہی تیری محبت ہے؟
بصارت کا قحط،(6)

ہوا پتوں کا رستہ دیکھتی ہے/بے شجر سڑکوں پہ پولی تھین کے خالی لفافے سر سراتے ہیں
خود اپنے موسموں کا خون پی کر/لوگ جر ثوموں کی صورت پل رہے ہیں
تابکاری کے الاؤ جل رہے ہیں/بد نمائی کے دُھوئیں سے/پھول کالے، تتلیوں کے پر سلیٹی
ہو چکے ہیں
خواب کا چہرہ/دباؤ سے بگڑ کر ٹوٹ جائے گا/نمی کو راستہ دو
درد کے بادل برسنے دو!!/زمیں پر آسماں کا دُکھ اُترنے دو!! (7)

معاصر اردو نظم میں ماحولیاتی مزاحمت کے حوالے سے لکھی جانے والی نظموں کی ایک خاطر خواہ تعداد موجود ہے، لیکن بعض شعری بیانیوں میں راست طرزِ اظہار کی جگہ علامتی رنگ اپنایا گیا ہے۔اِس ضمن میں علی محمد فرشی کی ایک رومانوی نظم 'علینہ 'اُس ماحولیاتی تانیثیت کے نقوش اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے، جیسے بیسویں صدی کے اواخر میں پذیرائی ملی۔ ماحولیاتی تانیثیت کی دونوں شاخوں ریڈیکل ایکو فیمینزم(Radical Ecofeminism)اور کلچرل ایکو فیمینزم(Cultural Ecofeminism)کی فلسفیانہ اساس میں یہ مشترک ہے کہ ایک پدر سری سماج میں جو قوتیں نسلی، طبقاتی، صنفی یا جنسی افتراق کی بنیاد پر انسان کا استحصال کرتی ہیں وہ فطرت کے استحصال کا بھی کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتیں۔ نسترن احسن فتیحی کے الفاظ میں:

Journal of Research (Urdu)
ISSN (P): 1726-9067, ISSN (E):1816-3424
Volume No. 40, Issue No. 1, June 2024

"ایکو فیمینزم کا نظریہ تحریکِ امن، خواتین کی صحت، ماحولیاتی تحریکات اور جانوروں کی آزادی جیسی تحریکوں سے نمو پزیر ہوا ہے۔ سر سبز و شاداب فطری حسن کی انکروچمینٹ اور عورت کے استحصال کے درمیان تعلق تاریخی ذہن سازی کا خاصا ہے جس کے نتیجے میں زمین اور عورت سکڑتی چلی گئی ہیں۔"(8)

درج بالا معروضات کے تناظر میں فرشی کی مذکورہ نظم کے کچھ حصے دیکھیے:

علینہ!/نئے آدمی کے/مقدر کا نقشہ بناتے ہوئے/مغربی ساحروں نے
تری فائلوں سے چرائے ہوئے راز کو/کس قدر ایٹمی زندگی کے تصور میں شامل کیا تھا
فقط ہیروشیما کی مٹی کو معلوم ہے/جس کی چھاتی سے لپٹی ہوئی موت اب تک/سنہری اجالے کی چادر میں
منہ کو چھپائے سسکتی ہے/بازار میں زندگی کتنے ڈالر میں بکتی ہے
ان بددؤں کو ضرورت نہیں بھاؤ معلوم کرنے کی/پاؤں تلے جن کے/نہریں رواں تیل کی ہو گئیں
عدل کے شہر میں/کتنی مائیں دلاسے کے پتھر پکاتے ہوئے سو گئیں
لڑکیاں دیکھتے دیکھتے پتھروں کی طرح ہو گئیں! (9)

علینہ!/غار سے نکلیں/کوئی رستہ بنائیں/اس گھنی، گاڑھی، سیاہی سے نکلنے کا
اندھیرے، اندھے، زہریلے دھوئیں میں/کاربن ہوتی ہوئی عمریں کہاں ہیرا بنائیں گی
کسی نیکلس، انگوٹھی اور جھمکے میں/چمک اٹھنا، کہاں دل کا مقدر ہے
ہمارے کوئلہ ہوتے دنوں کا غم/ہمالہ نے کہاں رونا ہے/کس تاریخ کا چہرہ بھگونا ہے! (10)

نظم کے درج بالا حصوں کا متکلم بیک وقت زمین اور زمین زادیوں کے کرب کی صورت گری کر رہا ہے۔ نئے آدمی کے مقدر کا نقشہ بنانے والے، دھرتی یعنی اپنی ماں کے سینے پر بھی ایٹم بم پھینک دیتے ہیں جس کے نتیجے میں زمین پر

اُگنے والی فصلیں اور آنے والی کئی نسلیں بانجھ ہو جاتی ہیں۔اِسی طرح اس تباہی و بربادی میں جو طبقے مقتدرہ کی معاونت کرتے ہیں انھیں زمین میں دفن معدنی وسائل پر اجارہ حاصل کرنے کا پروانہ مل جاتا ہے اور پھر یہی طبقہ اپنی دولت اور طاقت کے بل پر کمزور انسانوں خصوصاً عورت کے استحصال کا بھی کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔ "علینہ" کی معیت میں نئے زمانوں کو خواب دیکھنے والا انسان، دراصل اُسی آدم کا بیٹا ہے جس نے زمین پر پہلا قدم رکھا تھا، لیکن دُنیا کو ایک اندھے غار میں تبدیل کرنے کے بعد، وہ اب اِس اندھے غار سے باہر نکلنے کا رستہ تک کھو چکا ہے۔اُس کی سانسیں اندھیرے اور زہریلے دھوئیں کی بہ دولت گاڑھی سیاہی میں ڈھل رہی ہیں اور کاربن ہوتی عمروں نے سفید دنوں کو کوئلوں میں تبدیل کر دیا ہے۔اگر تباہی و بربادی کی یہ داستان اسی طرح جاری رہی تو وہ وقت دور نہیں کہ اِس زمین کا ہر ذی روح اُن فاسلز(Fossils) میں تبدیل ہو جائے گا، جن کا سراغ شاید آنے والے زمانوں کو بھی نہیں مل پائے گا۔

درج بالا معروضات کی روشنی میں یہ بات انتہائی واضح ہو کر سامنے آتی ہے کہ صنعتی و مشینی تہذیب کی اجارہ داری نے جس استحصالی طبقے کو زمین کی باگ ڈور سونپی ہے، ٹیکنالوجی اور عالمگیریت کی آڑ میں وہ محض کمزور انسانوں کو ہی جبر کا نشانہ نہیں بنا رہا بل کہ زمین پر موجود دیگر نباتات، حیوانات اور فطری مظاہر بھی اُس کے ہاتھوں فنا پذیر ہو رہے ہیں۔معاصر اردو نظم کا یہ اختصاص ہے کہ اس نے نظریوں اور آدرشوں سے مغلوب ہوئے بغیر محض فہم ،ادراک اور نئی شعری حسیت کی بہ دولت اس تمام پیچیدہ صورتِ حال کی عکاسی کی ہے جو کائنات میں وقوع پذیر ہونے والی ماحولیاتی تبدیلیوں کی زائیدہ ہے۔یہی وجہ ہے کہ آزاد اور نثری نظموں کے ساتھ ساتھ نئی شعری اصناف میں بھی ہمیں ماحولیاتی مزاحمت کے ایسے نقوش ملتے ہیں، جن سے معاصر نظم نگاروں کی فطرت کے استحصال اور اِس کے پسِ پُشت کار فرما عناصر کی نشان دہی کا بیانیہ ملتا ہے۔اس ضمن میں 'موہن جوداڑو' کے عنوان سے یہ نظمیہ عشرہ ملاحظہ فرمائیے:

میٹھے پانی شکست کھا چکے ہیں/بحرِ الہامِ شور کی آواز/دل سے اٹھتی ہے سر سے آتی ہے
دور اماوس میں تھر سے آتی ہے/آخری ایک مور کی آواز
جھڑتے پر یہ سوال اٹھا چکے ہیں/کس لیے اتنے دن رہا ہوں میں

Journal of Research (Urdu)
ISSN (P): 1726-9067, ISSN (E):1816-3424
Volume No. 40, Issue No. 1, June 2024

بے دلی، بے رخی ہے زوروں پر/ منحرف سانس گن رہا ہوں میں/انگلیوں سے بچھڑتی
پوروں پر!   (11)

حوالہ جات

1۔ محمد اقبال، بکھرے خیالات (اقبال کی ڈائری)، مترجم: ڈاکٹر عبدالحق، (دہلی: بزم احباب، 1975ء)، ص 73
2۔ اورنگ زیب نیازی، اردو ادب: ماحولیاتی تناظر، (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، 2023ء)، ص 12
3۔ ساقی فاروقی، سرخ گلاب اور بدرِ منیر، (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، 2005ء)، ص 117
4۔ ساقی فاروقی، سرخ گلاب اور بدرِ منیر، ص 138
5۔ ذیشان ساحل، ساری نظمیں، (کراچی: آج کی کتابیں، 2011ء)، ص 499
6۔ نصیر احمد ناصر، عرا بچی سو گیا ہے، (لاہور: تسطیر پبلشرز، 2002ء)، ص 67
7۔ نصیر احمد ناصر، عرا بچی سو گیا ہے، ص 54
8۔ نسترن احسن فتیحی، ایکوفیمینزم اور عصری تانیثی اردو افسانہ، (دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، 2016ء)، ص 12
9۔ علی محمد فرشی، علینہ، (اسلام آباد: حرف اکادمی، سن ندارد)، ص 45
10۔ علی محمد فرشی، علینہ، ص 12
11۔ ادریس بابر، عشرے، (راولپنڈی: سہیل الطاف پرنٹرز، 2022ء)، ص 41

Published by:
Department of Urdu
Bahauddin Zakariya University, Multan (Pakistan)-60800
Website: https://jorurdu.bzu.edu.pk/website/